U137OC 17.12.

Title - GHALIB AUR USKI SHAYARI

Author - Ahmad uddin Ahmad

Publisher - Unani Dawakhana Press (Allahabad)

Date - 1928.

Pages - 40

Subject - Ghalibiyaat - Tanqeed.

غالب اور اسکی شاعری

یعنی

غالب کے کلام پر ایک تنقیدی نظر

از

احمد الدین احمد صاحب مارہروی
بی۔اے

سنہ ۱۹۲۸ء

قیمت

یونانی دواخانہ پریس الہ آباد میں باہتمام منشی حامد حسین صاحب طبع
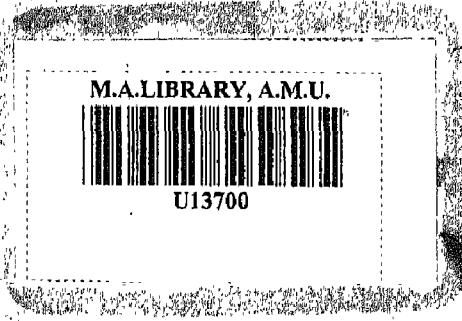
غالب اور اُسکی شاعری

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب
مندرجۂ بالا الفاظ سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا مضمون محاسن کلام
شروع ہوتا ہے۔
امر مسلمہ ہے کہ شاعری فنون لطیفہ میں سے افضل ترین فن ہے اور
ایام کے ساتھ نہ صرف اسکی وسعت، بلکہ اہمیت، ضرورت اور
منزلت بڑھتی جائیگی۔ میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ "نظم کا مستقبل
وسیع ہے، کیونکہ اسمیں استقلال اور تخیل کا عنصر غالب ہے نظم
لئے تخیل ہی خاص چیز ہے۔ باقی ایک عالم وا ہمہ ہے، نظم اپنی قوت
کو خیالات سے وابستہ رکھتی ہے اور یہ خیالات ہی واقعات ہیں"
مستقبل نظم کے وسیع ہونے میں شک نہیں، جوں جوں زمانہ گذرتا
ئے گا، یونانی عہد عتیق کے وہ فنون جو قرون وسطےٰ میں لاعلمی، تعصب
جہالت کے باعث قعر گمنامی میں پڑے ہوے تھے از سرنو تازہ ہوتے
ئینگے، چنانچہ ناٹک نویسی، موسیقی اور فن نظم دور حاضرہ میں نہ صرف
اب تعلیم کے جزو اعظم ہیں بلکہ کسی قوم کے شائستہ اور متمدن ہونے کے

لیے فرض ہی کہ وہ انکا اکتساب کرے۔

غدر دہلی کے بعد، جو بمنزلہ ہندوستانی نشاۃ جدید کے تھا۔ ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ طبقہ ان فنون کی اہمیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ پہلے فن نظم میں جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں اپنی گذشتہ عظمت کی یادگار باقی رہ گیا تھا، اصلاحات اور تجدید عمل میں آئی۔ اس دور کا پیشرو غالب ہی، اس نے نہ صرف قدیم بے رنگ شاعری کو جو محض گل و بلبل کا افسانہ، فراق و وصال کی داستان اور پوچ خیالات کا ڈھیر رہ گئی تھی بدلا، بلکہ اسمیں ایسی روح پھونک دی جس سے باوجود ظاہری صورت کے بہت کم مبدل ہونے کے، صوری معنوی میں کیف اور چاشنی پیدا ہو گئی۔

اول اول جس طرح انگلستان کے ملک الشعرا ورڈ سورتھ کو عامۃ الورود شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے اسی طرح غالب پر بھی لکیر کے فقیر شعرا کی نکتہ چینیوں اور پبلک کے مذاق کی خرابی کا اثر پڑا، جس طرح اسکاٹ اور بائرن کے سامنے ورڈ سورتھ کی شہرت نہ ہوئی، اسی طرح ذوق اور مومن خان کے سامنے کسی نے دور جدید کے پیغمبر کی پروا نہ کی، لیکن قابلیت جدت، خوبی بیان اور حسن معانی اہل بصیرت کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ نشاۃ جدید کے بعد مغربی خیالات کا دور دورہ ہوا، ہمنے اونکے اور انہوں نے ہمارے علم ادب کا اکتساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کس دنیائے رفیع میں ہیں اور ہم کس قعر مذلت میں، انہوں نے جائز طور پر ہمارے

کو ارذل ترین کہا (بلکہ آجتک اسی خیال میں ہیں) اس تاریکی میں صرف ایک شمع تھی، ایک شاعر تھا جسکو ہم اہل یورپ کے مقابلہ میں پیش کرسکتے تھے، جس کے اشعار میں ہم اپنی قوم کی عظمت رفتہ کے آثار، اور آیندہ بہبودی کی امید پا سکتے تھے، وہ غالب تھا جو اپنے سامعین اور ناظرین کے ہاتھوں پریشان" اور ناقدر شناس اصحاب کی نکتہ چینیوں سے پریشان ہوکر کہہ رہا تھا۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد — کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

[تمام اہل لسان متفق ہیں کہ اُردو کے شاعری کے تین ارکان ہیں میر، غالب، اقبال جنکو متعلق کہا جاتا ہے کہ

اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعت تخیل میں . . . .

گویا غالب دنیائے تخیل کا بادشاہ ہے اور تخیل وہ چیز ہے جو دنیا کو ایک دم میں تہ و بالا کردیتی ہے۔ یہ روسو کا تخیل ہی تھا جو (ایک بڑی حد تک) انقلاب فرانس کا بانی ہوا۔]

زبان اُردو میں شعرا اور اساتذہ کی کمی نہیں۔ سودا، میردرد، مصحفی، انشا، جرأت، ناسخ سے لیکر حسرت اور رہان صاحب تک جبر کے استاد موجود ہیں اور اپنی گذشتہ عظمت کی یادگار بڑے بڑے دیوان چھوڑ گئے ہیں لیکن "جو مجموعہ اُردو" کہ غالب نے چھوڑا ہے دلچسپی، نفاست، تعمق اور وسعت نظری میں لاجواب اور بے مثل ہے

اور بے مثل و لاجواب ہی رہے گا۔ لوگ نقالی کرینگے اور اسی کو اختیار کرکے مثل دیوان غالب کے ایک کتاب، تصنیف کی کوشش کرینگے۔ مگر جسطرح قرآن مجید، مثنوی مولینا روم اور گیتا کا جواب لکھنا ناممکن ہی اسی طرح شیکسپیر اور غالب کے پایہ کا امر محال،

میتھو آرنلڈ نے ورڈ سورتھ کی بابت لکھا ہی کہ اسکا کلام زمانہ کے ہاتھوں برباد نہو گا، بلکہ مشاہیر شعرار کے مجموعہ سے زیادہ دیر پذیر رہے گا۔ اگر یہی دعویٰ غالب کے لئے بھی کیا جائے تو حق ہو گا۔ غالب موجودہ نسلوں کے لئے منبع انبساط ہی اور آیندہ نسلوں کے لئے بھی منبع انبساط رہے گا۔ شارحین اُن اشعار کو جنکے متعلق بے معنی مہمل ہونے کی عام شکایت ہی لیکن جو در اصل گنجینہ معنی کا طلسم ہیں اور صاف کرکے دکھارہے ہیں اور وہی لوگ جو معمولی استعداد انکا اصل مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے اور اُنکو ہذیان سے زیادہ نہ سمجھتے تھے قائل ہورہے ہیں کہ غالب کا کلام ذوق، مومن، داغ وغیرہ سے کہیں زیادہ تخیل میں ڈوبا ہوا ہے، اِن لوگوں کے خیالات سطحی عامی اور بندشیں پرانی تھیں جو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی تھیں۔ لیکن غالب جمہور کا شاعر نہ تھا، اسکا پیام صرف ان لوگوں کے لئے ہی جنمیں اس سے مستفیض ہونے کی قابلیت اور صلاحیت ہی نہ کہ ان اصحاب کے لئے جو میر فرش بنکر واہ وا کرنے کے سوا کچھہ نہیں جانتے۔ چنانچہ خود کہتا ہی سا

تاثیر کو اتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر
محرم نہیں۔ وہ داد نہیں چاہتا بلکہ عمل کا خواہش مند ہے ع
گویا نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

وجہی ہمیں ..کا کلام تصوف اور فلسفہ میں ڈوبا ہوا ہے جو عوام کا حصہ نہیں
صاف ہے اور صرف معدودے چند اصحاب کے لیے ہے۔ لیکن جس طرح
شکسپیر کے لیے نہرلٹ بریڈلے، جانسن اور سر سیڈنی بی جیسے حواشی
او ..ن کی ضرورت تھی جو اسکے محاسن کلام، خوبی بیان اور طرز گفتار کو
ر ..لک کے سامنے بوضاحت پیش کریں اسی طرح ہمارا غالب بھی عوام کے
شناس ہونے کے لیے حالی اور عبد الرحمن بجنوری جیسے اہل قلم کا محتاج
اور واقعہ یہ ہے کہ غالب کی عظمت کا اندازہ یادگار غالب کی اشاعت
شروع ہوتا ہے اور جوں جوں ملک میں اس قسم کا لٹریچر بڑھتا جائیگا
وہ اسکی عظمت کو تسلیم کرنے لگا۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ نظم کا مستقبل بہت وسیع ہے بنی نوع انسان
بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ زندگی کی ترجمانی کرنے طمانیت قلب بخشنے
ور ہیجان میں سکوت پیدا کرنے کے لیے ہمکو نظم اور صرف نظم سے مدد لینی
ہے۔ بلا فن نظم کے سائنس اور نیچر نا تمام نظر آئینگی۔

سائنس اور نیچر کے مفید اور دلکش ہونے میں کس کو کلام ہے مگر جب تک
قادر الکلام شاعر ہماری آنکھوں کے سامنے بہار کا نقشہ نہیں کھینچتا ہم
اسکی اصل خوبصورتی اور سود مندی سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ موسم بہار

ہر سال آتا ہے اور چلا جاتا ہے، ہم پھولوں کی تر و تازگی سے مسرور ہوتے ہیں، لیکن جب ورڈسورتھ کہتا ہے کہ "سرسبز کنج میں جنگلی گلاب کی جھاڑیوں کے گرد پیچ در پیچ سنبل نے اپنے حجرے بنا رکھے تھے اور میرا عقیدہ ہے کہ ہر پھول نسیم سحری سے حظ حاصل کرتا ہے۔

پھولوں کی ڈالیوں نے ہوا لینے کے لئے اپنے پنکھے پھیلا رکھے تھے اور مجھے یقین واثق ہے کہ ان میں خوشی کے نمایاں آثار پائے جاتے تھے" تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کچھ اور بھی ہے جو ان ظاہری صورتوں سے زیادہ خوبصورت، زیادہ لطیف اور زیادہ طاقتور ہے جس طرح الفاظ کی ظاہری صورت کے پیچھے دریائے معانی موّاج نظر آتا ہے بعینہ ان پھول پتوں کے اندر روح زندگی اور مبدع عالم کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہ اپنی تعمق نظر سے معنوی حیثیت کا اندازہ کرتا ہے۔

ا/ جب غالب نسیم سحری کے متعلق کہتا ہے کہ ع ہے ہوا میں شراب کی تاثیر تو ہمکو ایک نئی دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ہم ہزارہا انسانوں کو روز و شب دیکھتے ہیں مگر شاعر انکی ہستی میں کچھ اور ہی چیز مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست

یہی جذبہ تھا جس سے متاثر ہو کر شاعر نے کہا ہے۔ بت کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کرد لیا۔ اور اسی سے متاثر ہو کر میری زبان سے نکلتا ہے۔ ع

مبدع حسن ہی ہے حسن کی دیوی میں تلاش

ا/ غالب دیکھتا ہے کہ ہم پتھر کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں، سمہ ہوا میں شراب

کی تاثیر کو مبالغہ اور غلط بیانی سمجھتے ہیں اور عاجز آکر کہتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

گویا ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ایک معمولی تنکے اور ارذل ترین کیڑے کو بھی عمیق نظر سے دیکھیں، اسکے جسم اور قد و قامت کو نظر انداز کرکے صانع مطلق کی صناعی، جزئیات اور ادا پہ بجنیٹلی پہ عش عش کریں

ورڈسورتھ شاعری کو جملہ علوم کی روح لطیف اور نفس سمجھتا ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ امر صحیح ہے کیونکہ مبدع علم نے جو اثر نظم میں رکھا ہے وہ نہ مرصع و مقفے نثر میں ہے نہ نثر عاری میں۔ اہل عرب جو اپنی شاعری سے جدا مجد ہیں ہر اس کلام کو جو دل پر جادو کا اثر رکھتا ہو جس سے ہمارے جذبات خفتہ مشتعل ہوتے ہیں، شعر کہا کرتے تھے چنانچہ جب قرآن پاک کی آیات کریمہ نازل ہوئیں اور انکا فوری اثر دیکھا گیا کہ لوگوں نے مذہب جیسی اہم ترین اور ضروری شے کو اس سے متاثر ہوکر ترک کر دیا تو انہوں نے اسکو بھی شعر سے تعبیر کیا

اس لحاظ سے گویا شعر جتنا پر اثر ہوگا اتنا ہی بلند پایہ۔ مگر شعر کے لیئے صرف پُر اثر اور بلند پایہ ہونا ضرور نہیں۔ بلکہ چند اصناف اور بھی ہیں جنکے بغیر شعر شعر کہے جانے کا مستحق نہیں۔

میتھو آرنلڈ اس بحث پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ "نظم میں اعلی و اسفل، معقول اور غیر معقول یا نیم معقول، صادق و کاذب یا نیم صادق کی تفریق اہم ترین ہے۔ اعلی نظم وہی ہے جسمیں ہمارے جذبا

و مشتعل کرنے، ہمیں خوش رکھنے اور ہمارے اندرونی خیالات کی
تصدیق کرنے کی قدرت ہو" اس اصول کے مطابق شعر وہی
ہے جسکے متعلق غالب کہتا ہی ؎

دیکھیو تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہی

اشعار کا مطالعہ کرتے وقت ہمارے دماغ میں اعلیٰ و اسفل کی
تفریق سب سے بالاتر رہنی چاہیے، لیکن معیار اعلیٰ میں بھی دو قسم
کے معیار ایسے ہیں کہ اگر ہم ہوشیار نہ رہیں تو وہ معیار اصلی پہ غالب
آجائینگے اور یہ دونوں مغالطاتی ہیں۔ آرنلڈ ان کو معیار تاریخی،
اور "معیار ذاتی"، کہتا ہی، کسی زبان کی ابتدائی تاریخ میں ایک شاعر جو
جو کسی طرح عامۃ الورود سے اچھا شعر نہیں کہہ سکتا ہی زمانہ کا استاد
مان لیا گیا، اسکے تلامذہ نے اُسکو بڑھا دیا اور ہم بھی ان لفاظیوں
کو سنکر اُسے استاد ماننے لگے۔ یہ تاریخی معیار ہی۔

ہمارے ذاتی تعلقات، اُنس و محبت یا واقعات حاضرہ اکثر
ہماری زبان سے شاعر کے حق میں ایسے الفاظ کا اعادہ کرا دیتے ہیں
جنکا وہ دراصل مستحق نہیں ہوتا۔ یہ معیار ذاتی ہی۔ تاریخی معیار قدما کے
مطالعہ میں اور ذاتی معیار ہمعصر یا زمانہ حال کے شعرا کے مطالعہ میں
ہمارے اصلی معیار پہ اثر کرتا ہی۔ اسلئے ہم کو دواوین اور کلیات کا
مطالعہ سوچ سمجھکر کرنا چاہیے۔ اکثر لوگ جو غالب کے طرفدار ہوتے
ہیں غیر منصفی سے کام لیکر ایک کے کلام کو محض بے اصول، بے معنی

اور اسفل گردانتے ہیں اور دوسرے کو اسکے مقابلہ میں نہ صرف اعلیٰ بلکہ معائب اور نقائص سے پاک مانتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ موجودہ دیوان غالب میں ایک خاص خصوصیت ہے جو دیگر دواوین میں نہیں ہے کہ اسمیں سے تیسرے درجہ کا کلام نکال دیا گیا ہے لیکن پھر بھی بہت سا مواد ایسا ہے جو یقیناً اعلیٰ نہیں کہا جاسکتا برخلاف اسکے ذوق کے دیوان میں اکثر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو غالب جیسا بلند معیار شاعر بھی قابل داد سمجھتا تھا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ طبائع مختلف ہیں اور معیار ذاتی کی غلط اندازی کا احتمال قوی ہے اسلئے اصلی معیار کا قائم کرنا جتنا اہم ہے اتنا ہی دشوار بھی۔ اس مسئلہ کا حل بھی ہمکو آرنلڈ کے صفحات سے ملتا ہے جس نے اس موضوع پر کافی معلومات بہم پہونچائی ہے وہ کہتا ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اساتذہ کے مسلم الثبوت اشعار، بند، مصرع برزبان کر لینے چاہئیں اور پھر انکو بطور محک کے استعمال کر کے کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرنی چاہئے، یہ ضرور نہیں کہ اشعار ایک ہی موضوع پر ہوں یا انمیں ایک ہی صنعت پائی جاتی ہو، بلکہ وہ اشعار جنکو جمہور بلند پایہ کہیں، کفایت کرینگے۔ مثلاً غالب کا یہ شعر ہے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابند نے نہیں ہے

اقبال کا یہ بند ہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے   شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل مجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے　　آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
ڈھونڈھو اب انکو چراغ رخ زیبا لیکر

ذوق کا یہ شعر سے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

شوق کی مثنوی کے چند اشعار سے

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　مورد مرگ نوجوانی ہے
صبحدم طائران خوش الحان　　پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

میر سے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم　　سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا　　حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

مومن سے

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے　　ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

انشا سے

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یہ اشعار جو یقیناً ہر شاعر کے بہترین اشعار نہیں بطور مثال کے لکھے گئے ہیں اور ہر سخن شناس اور صاحب ذوق سلیم کے واسطے راہبر ہو سکتے

ارسطو کا قول ہے کہ "تاریخ پر فن نظم کو محض اس وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ موخر الذکر میں گونہ راستبازی اور زیادہ سنجیدگی پائی جاتی ہے"۔

ہماری زبان میں بہت کم اشعار ایسے ہیں جنہیں یہ دونوں اصناف پائے جاتے ہوں اور جنہیں یہ محاسن موجود ہیں وہ اکملیت کے درجہ کو پہونچ گئے ہیں مثلاً انیس کا یہ شعر ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا اقبال

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری — خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

غالب

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کے ہاں اس قسم کے اشعار کی کمی نہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی بذلہ سنجی اور ظرافت بھی ہے۔ اور اگر بنظر غور دیکھا جائے تو اس ظرافت میں بھی ایک قسم کی سنجیدگی موجود ہے۔ اسکے ہاں انشا کا ٹھٹول نہیں۔ بلکہ سنجیدہ ظرافت کی چاشنی اور زندہ دلی ہے مثلاً چند اشعار

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مگر لکھوائے کوئی انکو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

"یہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں" — مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے،،

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

یا افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — انسان کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس کے پاس روزہ کھول کے کھانیکو کچھ نہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

زندگی بلا مزاح کے نفس کشی ہو جاتی ہی اور یہ چونکہ ہماری
کو سرد کرتی ہی لہذا ہم سنجیدہ ظرافت کو بھی حسن تغزل اور اصلیت
ساتھ اصناف شاعری میں شمار کرتے ہیں۔
کیٹس کہتا ہی کہ حسن تغزل وہ جذبہ ہی جو حسن اور خوبصورتی پایہ
ہو اور بقول اسکے "ایک حسین اور لطیف شے دائمی مسرت کہلائے جانیکی
مستحق ہی" اس لحاظ سے وہ شعر جسمیں حسن تغزل کا التزام رکھاجاسے ہمیشہ
اور مسرت کا ہمیشہ جاری رہنے والا سرچشمہ بن جائے گا۔ مثال کے طور پر
غالب کے چند اشعار اور مصرع

بات کچھ سر تو نہیں ہی کہ اٹھا بھی نہ سکوں
کیا قسم ہی ترے ملنے کی کہ کھا بھی سکوں
صبح کرنا شام کا، لانا ہی جوئے شیر کا

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ایشیائی شاعری میں مبالغہ و اغراق بھی ایک صنعت ہی اور
اصلیت کے منافی ہی۔ غالب بھی اس وبائے عام سے نہ بچ سکا۔ مگر
اسکی جانب داری میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بمقابلہ اور شعراء کے اسمیں اصلیت
زیادہ ہے۔ اصلیت سے یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ شاعر کہے وہ امر واقعہ ہو
بلکہ ہر واقعہ کو اس طور سے بیان کرے کہ اسکی تصویر آنکھوں کے سامنے
پھر جائے خواہ ایسا کبھی ہوا نہو۔ یا وہ شعر جسکو سنکر بے اختیار منہ سے

[illegible] جائے کہ شاعر سچ کہتا ہے مثلاً چند اشعار

[illegible]ان دی دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

[illegible]ل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا   مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

قید[illegible]یات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ایک نکتہ داں کا قول ہے کہ نظم انسان کی اکمل ترین تقریر ہے جسمیں وہ صداقت کے بالکل نزدیک آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن نظم میں یدطولیٰ حاصل کرنا آسان نہیں۔ اہل یورپ نے نظم کی تقریظ اور نکتہ چینی کے سخت ترین اصول قائم کئے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہے کہ انکے مسلم الثبوت شاعر دنیا کے ہر حصہ میں بلند پایہ مانے جاتے ہیں۔ ایک شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو انسانی زندگی کی ترجمانی میں مخصوص کر دے، چنانچہ شیکسپیر، دینٹ، ورڈسورتھ اور گوئٹی اس صفت میں سب سے پیش پیش ہیں اور نام آوری میں بھی سب سے آگے۔

کسی شاعر کے غیر فانی ہونے کے واسطے ضرورت ہے کہ اُسکے اشعار اہل زمانہ کے واسطے لابدی اور ناگزیر ہوں۔ جس طرح انسان بلا بچپن کی صنامی کے مسرور نہیں رہ سکتا اسی طرح بلا اس کلام کے اُسکو حقیقی مسرت حاصل نہو۔ اسکی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ وہ ہمارے خیالات کی ترجمانی کرے۔

انسانی زندگی آفات کو آلام کی پوٹلی ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کسکی جسمانی عوارض کی شکایت ہے تو کوئی روحانی تکالیف

سے بچیں۔ شاعر انکو تسلی دیتا ہی اور انسے نجات حاصل کرنے کا رستہ بتاتا ہی۔ مثال کے طور پر غالب کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہی رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہوگئیں

نقش نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

اس شعر میں ناامید نہ ہونے اور خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی گئی ہی

رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

علائق دنیا سے آزاد رہنے کی صورت۔

غم نہیں ہوتا ہی آزادوں کو بیش از یک نفس

یا

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہی کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

اسمیں بتایا ہی کہ دنیا میں عام طور پر نیکی کو بدی کے پہلو سے لیا جاتا ہی، لیکن اس خیال سے کہ لوگ برا کہیں گے نیکی کرنے سے ہاتھ روکنا نہیں چاہیے

دوم یہ کہ ہم اپنے دعادی کے واسطے اسکو مثل ایک خاموش کر دینے والی دلیل کے پیش کرسکیں یا بالفاظ دگر اُسکے مصرع اور اشعار بطور ضرب الامثال اور روزمرہ کے پیش کئے جاسکیں اس بارۂ خاص میں غالب تمام اردو شعراء سے پیش پیش ہی اسکا ایک ثلث کلام بلا

مبالغہ بطور ضرب المثل یا روز مرہ کے استعمال ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر گوہرے از خروارے چند اشعار ردیف الف سے

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

ہوئی تاخیر کو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

پوری پوری غزلیں ایسی ہیں جو ایک طرح پر "ناگزیر" کہلائی جانے کی مستحق ہیں۔ مثلاً صرف ردیف الف سے

درد منت کش دوا نہ ہوا الخ

یا عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا الخ

یا جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا الخ

جس طرح ٹامس گرے انگلستان میں وقت موعودہ سے قبل پیدا ہو گیا تھا اسی طرح غالب کا سب سے بڑا قصور اسکے ہمعصروں کی نظر میں اسکا بے وقت پیدا ہونا تھا۔ قطع نظر اس امر کے کہ غالب نے ایک بالکل انوکھا طرز تحریر اور تغزل ایجاد کیا جو عوام الناس کے لئے ناقابل فہم

تھا اگر ہم اس زمانہ کی لسانی حالت کا اندازہ کریں تو معلوم ہوگا کہ زبان رفتہ رفتہ بدل رہی تھی۔ میر کی سلاست عرصہ ہوا رخصت ہو چکی تھی گل و بلبل کے افسانہ جو متقدمین کے کلام میں ہجر کی ترجمانی کے طور پر استعمال ہوتے تھے انقلاب زمانہ کے باعث متاخرین کے ہاتھوں میں زیور شعر بن گئے۔ شاعری لفاظی پھبتی اور گل و بلبل کے افسانوں، ہجر و وصال کے بیان۔ شراب و کباب شیشہ و ساغر تک محدود رہ گئی تھی اور جو شخص ان قیود سے آزاد رہکر شعر کہنا چاہتا تھا اسکو نہ تو استاد شاعر مانتے اور نہ پبلک ہی میں اسکی کچھ قدر و منزلت ہوتی۔ اردو شاعری کی قسمت ہمیشہ رؤسا اور سلاطین کے دربار سے وابستہ رہی اور شاعر کو پبلک کے جذبات سے زیادہ اپنے آقا کی مرضی کا خیال رکھنا لازمی ہوتا۔ ان آقاؤں میں سے نوے فیصدی نالائق، پرانی لکیر کے فقیر اور انہیں پوچ خیالات کے مداح ہوتے تھے اور حفظ مراتب اور تحفظ ملازمت کے لئے لازم تھا کہ شاعر خواہ اپنی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہو۔ اسی روش پر چلے جو اسکے پیشرو مقرر کر گئے ہیں۔ غالب کو بھی ان قیود سے مفر نہ تھا، اگرچہ اسکے خیالات فلسفیانہ، اسکا تخیل ارفع اور نگاہ عمیق تھی، لیکن چونکہ ایک قدامت پسند دربار سے قسمت وابستہ تھی اسلئے بجز پامال راہ پر چلنے کے چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اسکی شکایت بھی کرتا ہی

ہرچند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہی شیشہ و ساغر کہے بغیر

مثلاً جب اسے غدر دہلی کے بعد مسلمانوں اور سلطنت مغلیہ کے آخری

تاجدار بہادر شاہ ظفر کی حالت دکھائی ہوئی ہے تو وہ کچھ اس خیال سے کہ سلطنت کی طرف سے باغی نہ قرار دیا جائے اور کچھ طرز قدیم کو نبھانے کے واسطے مندرجہ ذیل اشعار میں اسکا اعادہ کرتا ہے۔ گو بظاہر اس میں شب وصال کے بعد صبح کا پُر حسرت سماں دکھا کر ع

"تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل"

کو نصیحت اور عبرت کی تلقین کی ہے مگر اہل معانی سے پوشیدہ نہیں کہ شاعر کا ماحصل کیا ہے۔

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۔۔۔ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ۔۔۔ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔۔۔ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۔۔۔ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ۔۔۔ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ۔۔۔ یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں ۔۔۔ نے وہ سرور و سور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔۔۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

یا ہندوستان کی قسمت کے نئے مالکوں سے مخاطب ہو کر اپنی کس مپرسی کا اظہار ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی ۔۔۔ سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

دوسری اقوام کے ساتھ مراعات اور اپنے حق میں ظلم و ستم دیکھ کر غالب

پہیے قوم پرست سے صبر نہیں ہوتا اور کہتا ہے ؎

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے | ہم رہیں یوں تشنہ لب ایام کے

غالب نے سلطنت کے واسطے اکثر جام کا لفظ استعمال کیا ہے ؎

جانفزا ہے بادہ جسکے ہاتھ میں جام آگیا | سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

یا سلطنت دست بدست آئی ہے | جام مے خاتم جمشید نہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی انہیں خیالات کا اعادہ کیا گیا۔

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے | لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے | آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کیوں گردش ایام سے گھبرا نہ جائے دل | انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے | بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

یا ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جن لوگوں کو غدر دہلی کی مستند تاریخ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے انکو معلوم ہو گا کہ اس پر آشوب زمانہ میں کتنے بے گناہ مارے گئے اور قتل ہوئے۔

مندرجہ بالا شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

غالب اپنی وسیع النظری سے سلطنت کی تباہی اور قتل عام کے بعد اپنی قوم کی پستی اور ابتری دیکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو | آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اور پھر آخر میں لاچار و مجبور ہو کر کہتا ہے ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب | واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

چند لوگوں کا خیال ہی کہ بمصداق پیران نمی پرند و مریداں می پرانند غالب خود سیاسیات سے چنداں شغف نہ رکھتا تھا۔ بلکہ مندرجہ بالا اشعار کو شارحین اور تبصرہ نویسوں نے پولٹیکل معانی پہنا دیئے ہیں۔ لیکن علاوہ ان رقعات کے جنمیں غدر کے بعد دہلی کی تباہی کا رقت آمیز نقشہ کھینچا گیا ہی ہمارے پاس چند واضح اشعار بھی اس موضوع پر موجود ہیں۔ جنسے معلوم ہوتا ہی کہ اسکی حمیت قومی واقعہ نگاری اور حب الوطنی فیوض "شیشہ و ساغر" پر غالب آئی اور وہ اپنے دلی خیالات کی صحیح اور صاف الفاظ میں ترجمانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مثال کے طور پر اوپر کا شعر ؎

سلطنت دست بدست آتی ہی جام مے خاتم جمشید نہیں

یا وہ غیر مطبوعہ قطعہ ؎

بسکہ فعال ما یرید ہی آج ہر سلح شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہی آب انساں کا
چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہی گھر بنا ہی نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک تشنۂ خوں ہی ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(۲)

غالب چونکہ دو جداگانہ عصرین کے درمیان رشتہ منسلکہ ہی اسلیے اسکے ہاں عشق و محبت کے خیالات بھی ملیں گے اور فلسفہ الٰہیات اور سیاسات کے بھی، اور واقعہ یہ ہی کہ غالب جس طرح طرز جدید کا پیغمبر ہی اسی طرح طرز قدیم کا استاد، اور ایک قادر الکلام شاعر کا کمال یہی ہی کہ جس موضوع پر قلم اٹھائے اسکا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ مثلاً نیچرل شاعری میں بہار کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچتا ہو۔

پھر اس انداز سے بہار آئی | کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک | اسکو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہی سر تا سر | روکش سطح چرخ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی | بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے | چشم نرگس کو دی ہی بینائی
ہی ہوا میں شراب کی تاثیر | بادہ نوشی ہی بادہ پیمائی

اخلاقیات پر کس خوبی سے رقم طرازی کی ہی۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا | اور درویش کی صدا کیا ہی
نہ سنو گر برا کہے کوئی | نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی | بخش دو گر خطا کرے کوئی

یا رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

جو مدعی بنے اُسکے نہ مدعی بنیے جو نا سزا کہے اُسکو نہ نا سزا کہیے

پیچرڈ ہنلر کا قول ہے کہ "ہر شاعر کو فلسفی ہونا لازمی ہے۔ بلا فلسفہ کی بنیاد کے شعر روکھا پھیکا اور بے کیف معلوم ہوتا ہے" شاعر کا کام زندگی کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ اسپر تبصرہ کرنا بھی ہے اور اگر شاعر فلسفی نہیں تو وہ اپنا صنعت میں عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

غالب مصور بھی تھا اور فلسفی بھی یہی وجہ ہے کہ اسکا کلام "ناگزیر" ہے بعینہ جسطرح انسانی زندگی کے واسطے پھر اُس نے سب سے اول نکات زندگی کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کسکی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر انسانی زندگی کے فانی اور موجب ملال و آزار ہونے کی فلسفیانہ تصویر ہے۔

اسکا فلسفہ حیات ابن رشد کے فلسفہ سے ملتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے دو اشعار مشابہت کو واضح کر دینگے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ہر شخص کو معلوم ہے کہ حیات و ممات لازم و ملزوم ہیں۔ ہر عامی روز و شب ان خیالات کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی جس نظر سے ان تعلقات کو دیکھتا ہے یا ایک شاعر جن الفاظ اور جس طرز میں اس کا اعادہ کرتا

ہو وہ صورت حال کو دوسری ہی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ع
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

یا

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

موت کو ہمیشہ بھیانک اشکال میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ درست نہیں کہ جب زندگی "بند غم" ثابت ہو تو موت ہمیں ان آلام سے آزاد کر دیگی۔ غالب سقراط کی طرح زندگی پر موت کو اس وجہ سے ترجیح نہیں دیتا کہ اسکے متعلق علم نہیں کہ زندگی سے بہتر ہوگی یا نہیں بلکہ اسے یقین ہے کہ مر کر انسان ان قیود اور آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ وہ موت کو ایک مغموم (PESSIMIST) کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا جو موجودہ زندگی کو آئندہ کے تاریک خیالات سے ملوث کرتے ہیں بلکہ ایک مسرور (OPTIMIST) بنکر مختلف دلائل اور مثالوں سے ثابت کرتا ہے کہ موت ایک نعمت ہے۔ چنانچہ کہتا ہے

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یا۔ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

یہی وجہ ہے کہ ہم غالب کو اکثر موت کا خواہشمند دیکھتے ہیں، چنانچہ علاوہ رقعات کے اشعار میں بھی اسکا اعادہ کیا گیا ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

یا قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

یا مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

یا زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

موت اور زیست کے بعد وہ ہستی، مادہ، ہیولیٰ اور دنیا کی ماہیت پر غور کرتا ہے۔ اس باب میں اسکا فلسفہ بارکلے اور اسپنوزہ سے ملتا ہے وہ بھی دنیا کو مایا ہی خیال کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

یا ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

یا ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے موجود

یا ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

یا ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

حیات و ممات کے فلسفہ پر غور کرنے کے بعد وہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر کرتا ہے۔ خاموشی جسکے متعلق ورڈسورتھ کہتا ہے کہ "مردوں کا نشان امتیاز اور متوفین کا حق ہے" غالب کے خیال میں بھی موت کے مماثل ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

فلسفہ خندہ کو اس طرح بیان کرتا ہی۔

عرضِ نازِ خوشی دنداں برائے خندہ ہی ۔ دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہی
ہی عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل ۔ یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہی

وغیرہ

زندگی کی ناپائداری کو ان الفاظ میں بیان کیا ہی ؎

بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

یا تیری فرقت کے قابل اے عمر ۔ برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں

یا عمر کو بھی تو نہیں ہی پائداری ہائے ہائے

یا رہا کوئی گر تا قیامت سلامت ۔ تو اک روز مرنا ہی حضرت سلامت

کارلائل کا قول ہی کہ "ہر شخص کے متعلق سب سے ضروری شئے اسکا مذہب ہی" غالب کا کلام ایسے اشعار سے پُر ہی جس سے ہم اس کے مذہبی خیالات کا پورا پورا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہر مذہب و ملت کا پہلا اصول "وحدت" ہی۔ وہ اقوام بھی جو عملی طور پر ایک سے زیادہ معبودوں کو سجدہ کرتی ہیں نظریتاً اصولِ وحدت کو مانتی ہیں، چنانچہ عیسائیوں میں باپ، بیٹا، روح القدس ملکر ایک خدا ہوتا ہی۔ غالب بھی وحدت الوجود کا قائل ہی۔ چنانچہ کہتا ہی ؎

سب کو مقبول ہی دعویٰ تری یکتائی کا ۔ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

یا۔ اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہی وہ یکتا ۔ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اپنے رقعات میں ایک جگہ لکھتا ہی "اگر منظور کیجئے تو میں "دوئی ہوں"

ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں"۔ اشعار میں بھی انہیں خیالات کا اعادہ کیا ہے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ایک فلسفی ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ غالب جب سبزہ و گل کو دیکھتا ہے تو خود ہی سوال کرتا ہے کہ اگر بجز خدا تعالیٰ کے دنیا میں اور کوئی شئے موجود نہیں تو یہ کل کائنات کیا ہے ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے   نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ ع دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں اور افسوس کرتا ہے کہ کیوں اس نے اس قسم کے شکوک کو دل میں جگہ دی ع کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے۔ اسے ہر شئے میں جلوۂ الٰہی نظر آتا ہے ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے   طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
یا اصل و شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مثل سرمد شہید کے جو کہتے تھے کہ "بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم" وہ بھی ہر خاک کے پتلے میں خدا تعالیٰ کی تجلی دیکھتا ہے اور کہتا ہے ع ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

یا جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے   ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

وہ ارفع ترین ذات کی پرستش کرتا ہی ؎

ہی پرے عالمِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اسکے ہاں رسوم کی قید نہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہی ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یا۔ وفاداری بشرطِ استواری عینِ ایماں ہی مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

وہ کسی معاوضہ کے لیے نہیں بلکہ اپنے معبود کو خوش رکھنے اور صرف پرستش کے خیال سے عبادت کرتا ہی۔ اور کہتا ہی ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

اسکا مطمحِ نظر جنت اور حور و قصور سے کہیں ارفع ہی چنانچہ کہتا ہی ؎

ستائش گر ہی زاہد اسقدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہی ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

یا۔ واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہی تمہاری شرابِ طہور کی

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ان چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہی۔ وہ بہشت کا بھی خواہشمند ہی اور شرابِ کوثر کا بھی مگر اسکو اس نظر سے نہیں دیکھتا جس سے کہ عوام دیکھتے ہیں ؎

وہ چیز جسکے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہی

یا۔ سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

(۳)

اپنے طرزِ قدیم کو چھوڑ کر یہاں بھی غالب ہی غالب نظر آتا ہی مثلاً

کے طور پر موضوع وصال ؎

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یا اپنے ضعف اور لاغری کا بیان ؎

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے میرا ذمہ دیکھکر گر کوئی بتلا دے مجھے

یا شب ہجر کی تلخی درازی، تنہائی وغیرہ کا بیان ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یا۔ کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

یا نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

سیاہی جیسے گر جائے دم تحریر کاغذ پر مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

بدگمانی، رشک اور رقابت میں متاخرین نے بہت مبالغہ کیا ہے، مگر غالب انکو اس خوبی سے نباہتا ہے کہ اسکی افضلیت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔
مثال کے طور پر چند اشعار ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

یا۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

عشق و محبت کے جذبات کا فوٹو اگر نیچرل حالت میں دیکھنا ہو تو غالب کے صفحات کا مطالعہ کیجئے۔ اس سے معلوم ہو گا کہ در اصل "عشق" ہی کیا چیز۔ اور شاعروں کا عشق کیا بلا ہوتی ہی جسکے متعلق کہتا ہی ؎

آتش بازی ہی جیسے شغل اطفال | ہی سوز جگر میں بھی اسی طور کا حال
تھا موجد عشق بھی قیامت کا کوئی | بچوں کے لئے گیا ہی کیا کھیل نکال
یا بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل | کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہی دماغ کا

تقدیر کا مسخر تھا کہ غالب جو دراصل فلسفیانہ خیالات کی ترجمانی، الہیات کے بیان اور رموز تصوف کے انکشافات کے واسطے تخلیق کیا گیا تھا مروجہ رسوم کا پابند ہو کر ان فرضی افسانوں میں پڑ جائے، مگر نہیں، اس نے اس زمین میں بھی اپنا کمال دکھایا، ان قیود کا پابند ہو کر بھی آزاد رہا یہی وہ کمال ہی جسکے متعلق حافظ کہتا ہی ؎

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود | ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو اسکے عاشقانہ اشعار دیگر شعراء و اساتذہ سے کچھ زیادہ افضل نہیں لیکن بنظر تعمق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ان میں انسان کے حقیقی جذبات کی فراوانی ہی۔ بقول ڈاکٹر عبدالرحمن "غالب کے کلام میں ایک نئی دنیا پوشیدہ ہی جس کا پتہ حالی نے لگایا ہی۔ مثال کے طور پر صرف چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں، جنکے سطحی اور اندرونی معانی میں بعد المشرقین ہی ؎

ہم اڑانے کے بجو وعدہ کو مکرر چاہا | ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہم دیکھو

یا کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

یا ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم   قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

یا کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

متمدن زمانہ میں ہر شخص سوال کرتا ہے کہ "عشق دراصل ہے کیا چیز؟" اور اسکی مختلف طریقہ سے تاویل کرتا ہے۔ ہر شاعر کا عاشق بن جانا تو بجز "خلل دماغ" یا "بچوں کے کھیل" کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اگر واقعتًا دیکھا جائے تو یہ وہ پاک جذبہ ہے جس سے متاثر ہو کر مولانا روم نے مثنوی جیسی عدیم النظیر کتاب تصنیف کی اور عمر خیام اور سرمد کی زبان سے رباعیات، حافظ اور خسرو کی زبان سے غزلیات کہلوائیں۔

غالب اپنے طرز مخصوص میں اکثر جگہ عشق کی تعریف کرتا ہے، اس کی خصوصیات بیان کرتا ہے اور اسکو ہوا و ہوس سے متمیز کرتا ہے۔

عشق کیا ہے؟

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب   کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہاں پورے طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ عشق جذبہ خود اختیاری نہیں۔ بلا عشق و محبت کے زندگی بیکار اور بے کیف ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

یا بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے، اور یہاں

یا رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے   انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

جذبہ عشق بے اثر نہیں ؎

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

یا پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں

مگر جب دیکھتا ہے کہ ہر کہہ ومہ عشق کا دعویدار ہے، ہر بوالہوس اپ
آپکو عاشق کہتا ہے۔ نظارہ بازی کا نام "عشق" رکھا گیا ہے تو شکایت
ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کچھ لوگ عشق کو پرستش خیال کرتے ہیں۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس
آخری درجہ پرستش سے بھی بڑھکر ہے۔ غالب کہتا ہے کہ باوجود اسکے کہ

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار

مگر ؎

چھوڑونگا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

کیونکہ اسکے نزدیک تو "وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہے

(۴)

یار کے رخصت ہونے، یاد آنے، اور جانے کے بعد کی تصاو
کتنی دلکش اور مکمل ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

یا غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یا تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

یا جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے کیا خوب قیامت کا ہی گویا کوئی دن اور

شراب کے متعلق اسکے اشعار اور مصرعہ ضرب المثل ہیں ۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ایک شاعر ہمیشہ شراب کا خواہشمند رہتا ہی اور کسی صورت میں

اس سے سیر نہیں ہوتا ۔

کیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہی

یا میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں

گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یا کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہی ورنہ

ہی یوں کہ ہمیں درد تہ جام بہت ہی

یا پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہی

پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

یا ہی دور قدح وجہ پریشانی صہبا

یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

یا پھر ۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہی

رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

خیال معشوق کی جفا کاری اور استغنا کا نقشہ ان الفاظ میں

کھینچتا ہے اور اسمیں نصیحت بھی کرتا جاتا ہے کہ ؎

ہم نشیں جا بیٹھے لیکن اے دل — نہ کھڑے ہوجئے خوبانِ دل آزار کے پاس
ہمنے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن — خاک ہوجائینگے ہم تمکو خبر ہونے تک

یا ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں

یا نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر — کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو
یا یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں — عدو کے ہولئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

آہ و نالہ، شیون و فریاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر دل سے ہو تو با اثر ثابت ہوتا ہے مگر عملی طور پر اسکا اثر جیسا کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

یا آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

بلکہ اس سے درد و کرب میں اور اضافہ ہوجاتا ہے ؎

نہ کرتا کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

بے صبری، بے قراری اور بیکسی کی تصویر یوں کھینچتا ہے ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

اپنے گھر کی ویرانی، خستگی اور تباہ حالی کا شکوہ مختلف طریقہ سے کرتا ہے اور ہر مرتبہ ایک نئی بات پیدا کرتا ہے ؎

گھر میں تھا کیا کہ اسے غم ترا غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یا۔ اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

یا کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یا۔ گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

اوپر کے شعر میں پولیٹکل معانی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

عاشق ہمیشہ غمزدہ رہتا ہے اور اگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو زندگی رنج و الم کا افسانہ ہے جسمیں کہیں کہیں خوشی کی نامعلوم سی جھلک نظر آجاتی ہے ایک شاعر کو موسیقی میں اندوہ و الم کی لہر دوڑتی آتی ہے وہ انہیں راگوں کو زیادہ پسند کرتا ہے جنمیں الم افزا تخیل کی فراوانی ہو شیلی اپنی ایک نظم میں کہتا ہے "ہمارے شیریں ترین راگ وہ ہیں جو سب سے زیادہ الم افزا تخیل کی خبر دیتے ہیں" اور غالب کہتا ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ شاعر کی نظر حقیقت میں ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک زمانہ مصیبت میں مبتلا ہے تو اسکی زبان بے ساختہ واقعات کی ترجمانی کرنے لگتی ہے مثلاً

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا

یا رب ہے شاعری میں یہی ہنگامہ یا رب مجھے

(۵)

غالب بلحاظ خیالات، طرز بیان، تشبیہ اور استعارات کے اوریجنل تھا۔ وہ ہمیشہ عوام کے پا افتادہ راستہ سے گریز کرتا رہا، اسکا دماغ ہمیشہ نیا نیا

بحروں نئے استعارات نئی بندشوں اور نئے محاورات کی تلاش اور ایجاد میں منہمک رہتا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شاہ حاتم سے لیکر ذوق اور مومن تک ہر شاعر چونکہ ایک ہی رنگ میں اور ایک ہی موضوع پر خامہ فرسائی اور طبع آزمائی کرتا رہا ہے اسلئے اس زمین اور بحث پر کچھ کہنا نہ صرف دوسروں کا اتباع کرنا ہوگا بلکہ متاخرین اور متقدمین کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کرنا ایک قسم کی زلہ ربائی ہوگی، امر واقعہ یہ ہے کہ پرانی شاعری آج کل اسی وجہ سے بے کیف نظر آتی ہے کہ اسمیں اب نئے خیالات پیدا کرنا قریب ناممکن ہے۔

اسکا جدت پسند دماغ بجز بیدل کے جو خود ایک طرز جدید کا موجد تھا اور کسی کا تتبع نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ سب سے اول طرز بیدل ہی میں ریختہ کہنا شروع کیا۔ لیکن یہ دیکھکر کہ انکے ہاں بجز پیچ در پیچ استعارات اور بعید از فہم تشبیہات کے بلند پروازی تخیل ہیچ ہے، اس نے اس روش کو ترک کر دیا اور اس طرز مخصوص کا اجرا کیا جو عصر حاضرہ کی شاعری کا پیش خیمہ تھا۔

دنیا نے جس نظر سے اس پیشرو کو دیکھا وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی کسی نے کہا " اسے خبط ہو گیا ہے کہ اردو زبان میں فارسی محاورات کا بیجا استعمال کرتا ہے" کسی نے زبان اور طرز بیان پر اعتراضات کئے اور کسی نے شکایت کی کہ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

کوئی پھبتی کہتا اور کوئی گالی نامہ تیار کرتا۔ ہر مصلح قوم و ملت، ولی، پیغمبر

یا مبلغ جب اپنا کام شروع کرتا ہے تو ابتدا میں اسے اسی قسم کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ اسکی بردباری، حلم اور خندہ جبینی ان تمام مخالفین کو رام کر لیتی ہے۔ غالب نے کبھی ع کلوخ انداز را پاداش سنگ است کے مقولہ پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ انکے جائز اعتراضات پر توجہ کی، فارسی ترکیبیں جو ناموزوں معلوم ہوتی تھیں ترک کر دیں، زبان کو حتی الوسع سلیس کیا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی زمانہ میں اسکے سیکڑوں مداح اور ناظرین پیدا ہو گئے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ غالب جمہور کا شاعر نہیں، وہ صرف ایسے لوگوں کے واسطے شمع ہدایت ہے جو اسکے کلام کو سمجھتے اور اسپر عمل کرتے ہیں یہ لوگ یقیناً جمہور نہیں کیونکہ عام طور پر ہمارا ملک اسفل ناخواندہ اور پست خیال ہے۔

غدر دہلی سے پیشتر کا زمانہ، جبکہ غالب نے اس روحانی اور فلسفیانہ شاعری کا اجرا کیا کوئی ترقی کا زمانہ نہ تھا، ہر قسم کے علوم میں حتی کہ زبان فارسی میں جو چند سال قبل تک ہندوں کی مادری زبان رہ چکی تھی، انحطاط پیدا ہو چلا تھا۔ فلسفہ سے تو ہندوستانی مسلمانوں کو کبھی شغف ہوا ہی نہیں۔ سیاسیات سے لوگ محض بے بہرہ تھے، فن تاریخ بھی مثل شاعری کے قدیم طرز پر چلا آتا تھا۔ اس طرح گویا ایک طرف تو ترقی کا دروازہ بند تھا اور دوسری طرف انکی قدامت پسندی مانع جدت طرازی تھی۔ عوام سے قطع نظر انکے خواص بھی تعلیمی حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھے۔ انکا معیار زبان دانی اور [illegible] تھے، [illegible] کے شعرا و مشاہیر اسکے کلام کے نکات و فلسفیانہ خیالات اور غیر مروج استعارات اور بندشوں کو نہ سمجھ سکے تو اسکی

انکا قصور نہیں (کیونکہ انکا بھر کسیطرح آجکل کے عوام سے بڑھا ہوا تھا) بلکہ زمانہ کا قصور ہے
میرے نزدیک تو یہ اعتراضات جو غالب پر کئے گئے اسکے حق میں مفید
ثابت ہوئے۔ اسے موقع ملا کہ اپنے نقائص کی اصلاح کرے[1] اور اپنی زبان
کو اگر سب کے واسطے نہیں تو عوام اور متوسط طبقہ کے واسطے کچھ سلیس بنا
اور نیا جانا اعتراضات اور بیجا نکتہ چینیوں کو سنکر اپنے میں تحمل و بردباری
کی عادت پیدا کرے۔ خود شاعر نے بھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ان روکاوٹوں
سے اسکی روانی طبع میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور   پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

اب دیکھنا ہے کہ وہ کیا جدت طرازیاں ہیں جنکی وجہ سے غالب اس حد
تک مبہم کہا گیا۔ یہ دو قسم کی ہیں اندرونی اور بیرونی۔ اندرونی جنکا تعلق
خیالات سے ہے اور جو بیان ہو چکی ہیں۔ بیرونی جو زبان اور طرز بیان سے
تعلق رکھتی ہیں آگے آئینگی فی الحال یہ دیکھنا ہے کہ آیا بلند پروازی تخیل کے واسطے
زبان کو بھی وسعت دینے کی ضرورت ہے یا نہیں

اردو زبان، اس زمانہ کا تو ذکر ہی کیا ہے، آج بھی ناقص اور نامکمل نظر آتی
ہے۔ غالب خیالات کی فراوانی اور ارتفاع کے باعث مجبور ہوجاتا ہے کہ اپنے
دلی خیالات کو ہو بہو سپرد قلم کرنے کے واسطے الفاظ، استعارات، اصطلاحات

---

[1] یاد رکھنا چاہیئے کہ غالب دراصل فارسی کا شاعر تھا نہ کہ اردو کا۔ چنانچہ جہاں کہیں ذکر
آیا ہے تو کہہ دیا ہے ؎

فارسی بین تا ببینی نقشہای رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

اور مرکبات ایجاد کرے۔ چنانچہ کہتا ہے: ع

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

لیکن وہ ان کو اپنے دماغ سے نہیں نکالتا بلکہ جس طرح دوسرے الفاظ و محاورات کے لئے زبان اردو فارسی کی منت پذیر ہے۔ اسی طرح وہ بھی فارسی تراکیب کو اردو میں داخل کر کے زبان کو وسعت دینا چاہتا ہے اور باوجود لوگوں کی ہٹ دھرمی، قدامت پسندی اور مخالفت کے اسکے پیدا کردہ اکثر محاورات اور مرکبات رائج الوقت ہیں، مثال کے طور پر ستائش، غلط بردار، چراغ کشتہ، وارستگی، آتش خاموش وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ بقول عبدالرحمٰن بجنوری "شاعری منطق سے آزاد ہے" قواعد فصاحت ضرور پیدا کر سکتی ہے لیکن اشعار میں لطافت پیدا کرنا جو شاعر کا اہم ترین فرض ہے، قواعد زبان کے اختیار سے باہر ہے۔ شیکسپیر اور غالب جیسے قادر الکلام شعراء کا کام قواعد کی پابندی نہیں بلکہ یہ قواعد کا کام ہے کہ انکی پابندی کرے۔ مثال کے طور پر صرف ایک شعر لیتا ہوں جس سے واضح ہو جائیگا کہ شاعر کس طرح اپنے الفاظ کو تولتا ہے۔ ع

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

اس شعر میں حرفِ وفا قواعد کی رو سے غلط ہے۔ لفظ "وفا" صحیح قائم مقام ہوگا۔ لیکن جب ہم مصرعہ کو اس طرح پڑھتے ہیں۔ ع

ایک جا لفظِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا

تو ظاہر ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام کی سادگی، لطافت اور بے ساختگی رخصت ہو گئی

اس مثال سے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ ایک مسلم الثبوت شاعر کے
ہاتھ میں الفاظ مثل کٹھ پتلی کے ہوتے ہیں کہ جس طرح چاہے ان کو
استعمال کرے بلکہ یہ کہ غالب الفاظ کے حقیقی اثرات سے بھی واقف تھا۔

دوسری جدت کی پہلی مثال الفاظ، محاورات، مرکبات اور استعارات کو
فارسی زبان سے ترجمہ کرنا یا اُردو سانچہ میں ڈھالنا ہے جسکے متعلق ہم کہہ چکے
ہیں کہ اگر ہٹ دھرمی اور بیجا تعصب سے کام نہ لیا جائے تو ماننا پڑیگا کہ
اس طرح اُنہوں نے ہماری زبان کی بڑی خدمت کی، مگر افسوس کہ جس طرح گیہوں
کے ساتھ گھن پس جاتے اسی طرح مشکل اور دقیق کے ساتھ سہل اور ممکن الحصول
محاورات کو بھی اس زمانہ کے قدامت پسند طبقہ نے مسترد کر دیا اور زبان کی
وسعت دہی کیواسطے جو کوشش غالب نے کی تھی وہ نقش بر آب ثابت ہوئی۔

دور حاضرہ میں ماہرین لسانیات کو کما حقہ اندازہ ہو گیا کہ زبان اُردو بہت
ناقص اور نامکمل ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اسکو انگریزی قواعد کی مطابقت
سے وسعت دیجائے۔ غالب کا کمال صرف اس بات سے ظاہر ہے کہ جس ضرورت
کا ہمکو آج احساس ہو رہا ہے شاعر اُس سے ایک صدی قبل ہی واقف تھا۔

مثال کے طور پر چند اختراعی الفاظ اور محاورات درج ذیل ہیں:۔
وامہ شنیدن، موج رنگ، مشت خیال، یک شہر آرزو، فردوس گوش، کنگر
استغنا ہائے [illegible] کا پیرہن [illegible] دینا۔ دعوت آب و ہوا وغیرہم۔

[illegible] الفاظ [illegible] غالب [illegible] اپنے ایجاد کردہ [illegible] پر چلتا [illegible]
دماغ ہمیشہ کسی نئی چیز کی اختراع یا جدت کی فکر میں رہتا ہے اسکا منطقیانہ اور فلسفیانہ

دماغ نہیں سمجھ سکتا کہ جب متقدمین اور متاخرین نے نئی بحروں اور نئے محاورات کا استعمال کیا تو وہ کیوں اس سے گریز کرے، چنانچہ اس نے ان بحور کو ایجاد کیا جنکو عبدالرحمٰن بجنوری نے "افتاں وخیزاں بحریں" کہا ہی۔ تعصب کی اور بات ہی لیکن اگر بنظر غور دیکھا جاے تو جو سادگی اور بے اختیاری ان بحروں میں نظر آتی ہی وہ عدیم النظیر ہے، مثال کے طور پر ـــ

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا ۔۔۔ دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا الخ
یا آگے مری جان کو قرار نہیں ہی ۔۔۔ طاقت بیداد انتظار نہیں ہی الخ
یا عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے ۔۔۔ کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہی دو قدم آگے الخ
یا کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے ۔۔۔ اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے الخ

لیکن آجتک صرف ایک شخص ایسا پیدا ہوا ہی جس نے ان بحور کو قدر کی نظر سے دیکھا اور یہ وہ ہستی ہی جسکے متعلق ایک دنیا کہہ سکتی ہی کہ اس نے غالب کو سب سے زیادہ سمجھا ہی، جسنے دیوان غالب کو مقدس وید کا ہم پلہ کہا ہی اور جسکے الفاظ سے ہمارا یہ مضمون شروع ہوتا ہی۔

۶

ورڈسورتھ کے متعلق لوگ سوال کرتے تھے کہ اسکے کلام کی خوبی کس قسم کے اشعار اور نظموں میں ہی۔ جسکے جواب میں میتھو آرنلڈ کہتا ہی کہ اسکی چھوٹی اور سلیس نظمیں اُسکے طرز مخصوص کی حامل ہیں۔ غالب کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہی کہ "اُسکی چھوٹی بحر کی نظمیں تیر و نشتر ہیں"۔

مگر یہ کہنا کہ غالب کا کمال ان چھوٹی غزلوں تک محدود ہی، زیادتی ہی، البتہ

اس امر سے کسی ذی شعور کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ غزلیات اُسکی تیر و نشتر ہیں جہاں سادہ وسلیس عبارت کے پردہ میں چھپتے ہوئے خیالات پوشیدہ ہیں جو دل میں فوراً جگہ لیتے ہیں۔ انکے متعلق سب سے ضروری بات یہ ہے کہ مثل سعدی کی بوستاں کے انکو بھی سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی غزلیات سے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند نے نہیں ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجر بید نہیں

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

کتنا صرف میر یا غالب جیسے قادر الکلام اساتذہ کا حق ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس طرز و زبان میں اشعار کہنا چنداں دشوار نہیں۔ مگر جب اس کلام میں ہاتھ ڈالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا مقابلہ کرنا۔ ع

سورج کو چراغ ہے دکھانا

اگر

آپ اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہیں

آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے

تو

"سلسلہ تاریخ عالم" کا مطالعہ کیجیے جس میں جملہ اقوام کے عروج، زوال، تمدن و معاشرت کا بیان پوری شرح و بسط کے ساتھ مندرج ہے۔ اس سلسلہ کی دو جلدیں تیار ہو گئی ہیں۔

اسپین :- ہسپانیہ عظمیٰ کی تاریخ، مسلمانوں کے عروج و زوال، عبد الرحمن الناصر کی سطوت کا مرقع۔ با تصویر اور نقشہ۔ قیمت

افغانستان :- سلطنت مغلیہ کے زوال سے آجتک کی مکمل تاریخ۔ امیر حبیب اللہ خاں اور شاہ امان اللہ خان غازی کے دور حکومت کے حالات۔ با تصویر مجلد مع نقشہ افغانستان۔ قیمت

مینیجر سفیر بک ایجنسی نمبر ۸ منڈی الہ آباد سے طلب فرمائیے